مسز رابعہ اقبال :

اردو تحقیق کی ترقی میں پاکستانی خواتین کا حصہ

تحقیق ، علم و فن کا نہایت اہم شعبہ ہے ۔ بات زبان کی ہو یا واقعات کی ، تحقیق کے بغیر صحیح نتائج تک رسائی ممکن نہیں۔ دیگر علوم و فنون کی طرح اردو ادب میں بھی تحقیق کا اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے۔ اس سلسلے میں خواتین کی خدمات بھی ایسی وقیع اور جامع ہیں کہ وہ ہر طرح قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ اردو تحقیق کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس میں خواتین کے تحقیقی کاموں کا تفصیلی ذکر نہ ہو، اور ان کا مکمل جائزہ نہ لیا جائے۔

قیام پاکستان کے بعد ، پاکستان میں خواتین کی عام بیداری ، تعلیم کے میدان میں پیش رفت ، اپنے مسائل میں دلچسپی اور ان پر غور و فکر ، ان کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنانے کا خیال ایک اعلیٰ و ارفع پیمانے پر نظر آتا ہے ۔ یہی صورت کم و بیش ہندوستان کے ادبی منظر پر بھی دکھائی دیتی ہے ۔

اردو شعر و ادب کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے میدان میں بھی پاکستان و ہندوستان کی خواتین کم و بیش چالیس سال سے حصہ لیتی نظر آتی ہیں۔ اگرچہ یہ سلسلہ اس سے پہلے ہی

قائم ہو چکا تھا۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ تحقیق کے میدان میں خواتین میں سر فہرست ہیں۔ وہ پہلی مسلمان خاتون ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب میں انگلستان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا "The Development of Urdu Novel" یہ ڈگری انھیں "لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز" سے جاری ہوئی۔ محترمہ نے اپنا تحقیقی مقالہ سنہ ۱۹۴۰ء میں پیش کیا۔ اب کہ سنہ ۱۹۸۸ء کا وسط ہے اس مدت کو اتنے برس ہوئے ہیں (جو کہ خاصا طویل عرصہ ہے) اس وقت تک کم و بیش ۲۵ خواتین نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اور خواتین اعلیٰ پایے کے تحقیقی مقالے پیش کر چکی ہیں۔ اور یہ کام معیار و مقدار کے لحاظ سے یقیناً ایسا ہے کہ اس کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد سے ذیل میں ایک جائزہ زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جو درج ذیل مطبوعہ تحقیقی مقالات پر مبنی ہے۔

۱. ڈاکٹر صفیہ بانو تمنائی : "انجمن پنجاب تاریخ و خدمات"، کراچی، ۱۹۷۸ء۔

۲. ڈاکٹر شاھدہ بیگم : "سندھ میں اردو"، کراچی، ۱۹۸۰ء۔

۳. ڈاکٹر سلطان بخش : "دیوانِ تراب (ترتیب و تدوین)"، کراچی، ۱۹۸۶ء۔

۴. ڈاکٹر امت الحمید کوثر : "اردو کی علمی ترقی میں سر سید اور ان کے رفقائے کار کا حصہ"، ۱۹۸۴ء۔

۵. ڈاکٹر رضیہ نور محمد : "اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی

علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی
جائزہ"، لاہور، ۱۹۸۵ء۔
۶. ڈاکٹر بیگم بسم اللہ نیاز : "اردو گیت"، کراچی، ۱۹۸۶ء۔

"انجمن پنجاب تاریخ و خدمات"

ڈاکٹر صفیہ بانو تمنائی کا تحقیقی مقالہ "انجمن پنجاب تاریخ و خدمات" کے موضوع پر ۱۹۷۸ء میں چھپ کر سامنے آیا ہے۔ اس مقالے پر موصوفہ کو ۱۹۷۶ء میں پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی گئی۔ ان کے نگراں ملک کے مشہور محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب ہیں۔ یہ مقالہ ۴۶۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

فن تحقیق ایک مشکل فن ہے اور اپنے موضوع کے ساتھ انصاف چاہتا ہے۔ یہ مواد کی فراہمی اور اس کی صحیح پرکھ، اسناد کی صداقت، تقابل اور تنقیدی شعور کا محتاج ہے۔ یہ ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ اس میں بڑی دیدہ ریزی اور ریاضت و مشقت کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر صفیہ بانو تمنائی نے اس عظیم اور اہم انجمن کے صحیح اور مستند احوال کو رقم کرنے میں بڑی جانفشانی کا ثبوت دیا ہے۔ اس مقالے سے پہلے "انجمن پنجاب" پر اس قدر تفصیلی مطالعہ کتابی صورت میں کہیں نہیں ملتا۔

ڈاکٹر معین‌الدین عقیل اپنی تصنیف "پاکستان میں اردو تحقیق" میں رقم طراز ہیں:

> "مبسوط اور مستقل کاموں میں 'انجمن پنجاب' پر ڈاکٹر صفیہ تمنائی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ 'انجمن پنجاب تاریخ و خدمات' کراچی ۱۹۷۸ء مفید اور معلوماتی ہے اور

اس موضوع پر پہلی مفصل تصنیف ہے"۔ ۱

ڈاکٹر اسلم فرخی نے محمد حسین آزاد پر اپنے تحقیقی کام میں انجمن پنجاب کی خدمات کا ذکر کیا ہے لیکن یہ مطالعہ ہنوز تشنہ تھا اور اس کے لیے وہ تفصیل درکار تھی جو انجمن پنجاب کی خدمات کا بھرپور جائزہ لے سکے۔ بلاشبہہ فاضل مقالہ نگار نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تعارف اور تمہید کے بعد ڈاکٹر صفیہ نے اپنے مقالے کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول اردو کی ترویج و اشاعت کے اداروں فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخ پر مبنی ہے۔ موصوفہ نے بڑی محنت سے متعلقہ اداروں کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں اور اس باب میں خاصا مفصل احوال موجود ہے۔ دوسرا باب انجمن پنجاب کے سیاسی اور سماجی پس منظر پر مبنی ہے۔ محترمہ نے اسی باب میں ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں۔

الف۔ برطانوی دور کی تاریخ، سیاسی اور سماجی پس منظر۔

ب۔ علوم قدیم اور علوم جدیدہ کے متعلق بحث اور اورینٹل کی تجویز۔

ج۔ جدید ادب اور سر سید اور سید محمود کی تعلیمی مساعی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ان دو ابواب کو فاضل مصنفہ نے بڑی محنت اور شرح و بسط سے لکھا ہے مگر کتاب کے موضوع سے ربط پیدا نہیں ہوسکا۔

تیسرے باب میں انجمن پنجاب ۲۱ جنوری ۱۹۶۵ء کے قیام مقاصد اور تاریخ سے بحث کرکے اس کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا

۱۔ ڈاکٹر معین‌الدین عقیل: "پاکستان میں اردو تحقیق" کراچی، انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۸۔

ہے۔ اس انجمن کے روح و رواں کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر تعلیمات صوبۂ پنجاب تھے انہوں نے ڈاکٹر لائٹنر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کو انجمن قائم کرنے کی ہدایت دی تھی۔ پنجاب میں اردو ادب کی ترقی کا دامن ڈاکٹر لائٹنر سے وابستہ ہے۔ پنجاب اپنی ذہنی ترقی اور عام بیداری کے لیے سب سے زیادہ انھی کا مرھونِ احسان ہے۔ ان کی کوششوں اور رات دن کی مساعی جمیلہ سے اورینٹل کالج اور پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔

انجمنِ پنجاب کا نام ابتدا میں "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" رکھا گیا تھا جو بعد میں صرف "انجمن پنجاب" رہ گیا۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد میں چند یہ تھے۔

۱۔ قدیم مشرقی علوم کا احیاء۔

۲۔ دیسی زبانوں کے ذریعے عوام میں تعلیم کا فروغ۔

۳۔ معاشرتی، ادبی، سائنسی اور عام دل چسپی کے مسائل پر تبادلۂ خیال۔

۴۔ صوبے کے تعلیم یافتہ اور با اثر طبقوں کو حکومت کے قریب لانا۔

"انجمن پنجاب" کے تحت جو جلسے ہوئے ان کا تفصیلی احوال اس مقالے میں ملتا ہے۔ انھی جلسوں میں سے ایک جلسے میں جو ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کو منعقد ہوا کتب خانے سے متعلق تجاویز پیش کی گئیں اور انجمن کے تحت ایک لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ "انجمن پنجاب" کے تحت عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور ہندی زبانوں کی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ احیائے علوم مشرقی اور اردو زبان و ادب کی ترقی اس انجمن کے شاندار کارنامے ہیں۔ اورینٹل کالج اور پنجاب یونیورسٹی کا قیام اسی انجمن کی مسلسل جدوجہد کا کارنامۂ خاص ہے۔ محترم صفیر تمنائی نے بڑی

محنت اور عرق ریزی سے تاریخ وار ان جلسوں کی روداد اپنے مقالے میں پیش کردی ہے۔ انجمن پنجاب کے بہت سے کوائف جو پردۂ اخفا میں تھے اب کتابی صورت میں یکجا ہوگئے ہیں اور آئندہ کام کرنے والوں کے لیے حوالے کا کام دیں گے۔

چوتھے باب میں احیاے علوم مشرقی کے سلسلے میں اورینٹل کالج کی تاسیس اور ابتدائی کوششوں سے لے کر یونیورسٹی تک کا درجہ حاصل کرنے کے حالات بیان کیے ہیں اور مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں نے مل جل کر اردو ادبیات کے فروغ کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان کا بالتفصیل احوال درج ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر کی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ ان کی دور رس، دوربین نگاہ نے لارڈ میکالے کی ناقص تعلیمی پالیسی کو بھانپ لیا تھا اور نہایت شد و مد سے اس کی مخالفت کی تھی کیونکہ اس کی تعلیمی اسکیم ہندوستان میں کلرک ساز ادارے بنا رہی تھی۔

ان تعلیمی سفارشات کی سب سے بڑی خامی ہی یہ تھی یا دوسرے معنوں میں اس تعلیمی پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ اہل ہند اپنی تہذیب اور صدیوں سے قائم روایتوں سے کٹ جائیں اور مکمل طور پر انگریزوں کے غلام ہو جائیں۔ اس طرح ملک کی ذہنی اور اخلاقی نشو و نما اور ترقی کا خاتمہ یقینی تھا۔

لیکن یہ بات برصغیر کے باشندوں اور بالخصوص اہل پنجاب کو پسند نہ تھی وہ دل سے برصغیر کے طلبہ کی ذہنی اور اخلاقی ترقی کے خواہاں تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر، مسٹر ای ولمٹ اور متعدد حقیقت شناس انگریز بھی ان کے ہمنوا ہوگئے۔ "انجمن پنجاب" نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ مدارس قائم کرکے دیسی زبان

کی ترویج و اشاعت کرکے حکومتِ وقت پر ثابت کردیا کہ ان کی تجاویز حقیقت پسندانہ ہیں۔ بالآخر "انجمن پنجاب" کی پرخلوص جدوجہد، پنجاب کے نوابوں، راجاؤں، رئیسوں کے تعاون سے ۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۹ء کو لاہور یونیورسٹی اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اورینٹل کالج اپنی کارکردگی کی وجہ سے دور دور کے علاقوں میں مشہور ہوا اور تدریس و تحقیق، تصنیف و تالیف کا ایک عظیم الشان ادارہ بن گیا۔

اسی باب میں آگے چل کر فاضل مصنفہ نے "انجمن پنجاب" کی اردو زبان و ادب کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۸۵ء تک کے دور کو اردو ادبیات کا سنہرا دور کہا ہے، اسی زمانے میں کئی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا۔ اخبارات و رسائل کا اجرا ہوا۔ اردو دفتری زبان قرار پائی۔ ادبی، معاشی و معاشرتی مسائل پر نصابی کتب لکھوائی گئیں۔ تقریباً ۳۶۰ مضامین اور کتب جو نصابی اور غیر نصابی موضوعات پر لکھی گئیں، ان کا مختصر احوال درج ہے۔ ان مضامین نظم و نثر نے اردو زبان و ادب، تخیلات اور اسالیب میں انقلاب برپا کردیا۔ "رسالہ انجمن پنجاب" کا ذکر بھی اس باب میں موجود ہے۔ جو خدمات جلیلہ اردو ادبیات کی اس رسالے نے سرانجام دیں اس کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں ڈاکٹر صفیہ نے انجمن پنجاب کے مشاعروں کی تفصیل بیان کی ہے اور تقریباً ہر مشاعرے سے چیدہ چیدہ کلام بھی پیش کیا ہے۔ انجمن پنجاب کے عنوانی مشاعروں کی بنیاد ۸ مئی ۱۸۷۴ء کو لاہور میں رکھی گئی۔ اس جلسے میں مولانا آزاد نے اردو شاعری میں انقلاب برپا کرنے کی تجویز پیش کی۔ پہلا مشاعرہ

تیس مئی ۱۸۷۴ء کو ہوا - نو مشاعروں کا تفصیلی احوال فاضل مقالہ نگار نے تاریخ انعقاد اور حوالے کے ساتھ پیش کیا ہے - انجمن پنجاب کے عنوانی مشاعروں سے جدید اردو شاعری کی داغ بیل پڑی اور ایک ماحول پیدا ہوا - حالی اور آزاد جیسے جید شعراء کی تطہیر ذہنی ہوئی ، اردو شاعری میں ایک انقلاب برپا ہوا اور وہ جدت سے ہمکنار ہوئی - فاضل مقالہ نگار نے مشاعروں اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات کا مکمل جائزہ لیا ہے اور تحقیق و تنقید کرکے اپنے مقالے میں پیش کردیا ہے اور مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے ہیں۔

"انجمن پنجاب" اور مشاعروں کی سیاسی اور سماجی حیثیت سے اہمیت واضح کی ہے اور بتایا ہے کہ اہل ہند نے ان کی وجہ سے حکومت وقت سے مطابقت پیدا کی - اردو ادبیات کو فروغ ہوا اور حصۂ نظم استوار ہوکر نئی منزل کی جانب رواں ہوا - ادب کو افادیت کے تصور سے آشنا کیا - برصغیر میں مقصدی شاعری نے رواج پایا - اس کے اثرات پنجاب سے نکل کر پورے ہندوستان پر مرتب ہوئے -

باب ششم میں محترمہ صفیہ تمنائی نے انجمن کے نثری ادب پر بحث کی ہے اور بطور خاص مولانا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے تنقیدی شعور اور افادی ادب کے متعلق مدلل اور رواں تبصرہ کیا ہے مولانا آزاد نے آب حیات "انجمن پنجاب" کی مجالس میں قسط وار پیش کی تھی - رسالہ انجمن پنجاب جو انجمن پنجاب کی کاروائیوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے جاری کیا گیا تھا اس میں بھی مولانا آزاد کے تنقیدی مضامین شایع ہوتے رہے - اردو ادب میں آزاد کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے ۱۵ اگست ۱۸۶۸ع کو لاہور میں انجمن پنجاب کے مشاعروں میں جدید شاعری اور

انگریزی انشاپردازی کے متعلق لیکچر دیے اور شاعری کو پرکھنے کے جدید نظریے اور زاویے پیش کیے۔ مولانا حالی، مولانا آزاد کے شانہ بشانہ رہے اور انجمن پنجاب کے جلسوں میں شرکت اور لاہور کے قیام نے ان میں ذہنی تبدیلی پیدا کی اور اسی نے ان سے "مقدمہ شعر و شاعری" جیسی تنقید کی اولین اور معرکہ آرا کتاب لکھوائی۔ آب حیات بھی لاہور میں لکھی گئی جو تذکروں کے دور کے بعد تذکرے اور تاریخ کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے۔ صفیہ تمنائی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اردو ادب پہلی دفعہ ان نکات سے واقف ہوا۔

مولانا نے لسانی تحقیق کا راستہ دکھایا۔

بھاشا اور فارسی انشا پردازی کو سموکر ایک نیا طرز نگارش ایجاد کیا۔

اردو غزل کے نقائص کی نشان دھی کی۔

شاعری کو مقصدیت سے ہم آہنگ کیا۔

باب ہفتم میں انجمن کی لسانی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے نئے اسالیب اور نئے الفاظ کا مناسب استعمال اور ان سے متعلق مضامین کا ذکر ہے۔ ڈاکٹرصاحبہ نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ زبان و بیان کی تبدیلیوں کا جائزہ لیا ہے اور اس سلسلے میں "انجمن پنجاب" کی جامع خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی انجمن کی نگرانی میں قواعد کی کتابیں تیار کی گئیں ان سب کی فہرست بھی پیش کی ہے۔ اس باب میں انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سنہ ۱۸۸۶ء میں گو "انجمن پنجاب" ختم ہوگئی لیکن اس نے اردو زبان و ادب کی وہ خدمات انجام دیں جو پہلے دور میں دبستانِ دھلی اور

دبستان لکھنؤ نے سر انجام دی تھیں۔ اس کی وجہ سے پنجاب کے گوشے گوشے میں آج بھی اردو پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ یہاں اعلیٰ درجے کا ادب آج بھی تخلیق کیا جا رہا ہے اصلاحی تحریک کی بنیاد کا پہلا پتھر یہیں رکھا گیا اور ادب سے زندگی کا رشتہ اسی انجمن نے جوڑا۔ باب ہشتم "رسالہ انجمن پنجاب" کی روداد پر مبنی ہے۔ رسالے کے جاری ہونے کی تاریخ، اس کے اسباب اور افادیت کا ذکر ہے۔ انجمن پنجاب کے جلسوں میں جو تعلیمی اور ثقافتی مضامین پڑھے جاتے تھے وہ رسالے میں شایع ہوجاتے تھے۔ ان مضامین میں جو مضامین نصاب سے متعلق ہوتے تھے انھیں کمیٹی منظور کر کے کالج اور یونیورسٹی کے لیے کتابی شکل میں شایع کردیتی تھی۔ فاضل مقالہ نگار نے بڑی محنت سے ان کتابوں پر تبصرہ کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان مضامین کی اشاعت و مقبولیت نے ثابت کردیا کہ اردو ذریعۂ تعلیم ہوسکتی ہے، اس میں تمام مضامین کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ علمی مضامین کے علاوہ اس رسالے میں ادبی مضامین بھی شایع ہوتے تھے۔ سر سید احمد خان اور محسن الملک کے مضامین بھی اشاعت پذیر ہوئے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی شہرۂ آفاق تصانیف آبِ حیات، نیرنگِ خیال، سخندانِ فارس بھی اسی رسالے میں قسط وار شایع ہوتی رہیں۔ ان مضامین سے اردو زبان کے لب و لہجے اور لغت میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

نویں اور آخری باب میں پنجاب اور دیگر صوبوں میں "انجمن پنجاب" کے مرتب شدہ اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے اور سر سید کی علمی و اصلاحی تحریک نے اس انجمن سے کس طرح اثر قبول کیا اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور ان تمام سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے جن کی وجہ سے انجمن

میں انحطاط شروع ہوا، اور سنہ ۱۸۸۶ ع تک رفتہ رفتہ اپنی لافانی یاد چھوڑ کر خاتمے کو پہنچ گئی۔

محترمہ نے اس باب میں ساری کتاب کا نچوڑ پیش کردیا ہے اور بتایا ہے کہ "انجمن پنجاب" بھی دیگر ادبی تحریکوں کے انداز کی ایک تحریک تھی لیکن اس میں ہم گیری اور ہم جہتی پائی جاتی ہے۔ یہ ایک فعال تحریک تھی جس نے سارے ہندوستان پر اپنے اثرات چھوڑے اس نے ادب کی تفریحی و ذوقی حیثیت بدل کر اسے اجتماعی مقاصد سے آشنا کیا۔ اردو ادب میں پہلی دفعہ ادب کی عمرانی و تہذیبی اہمیت کا اندازہ لگا کر اردو میں مقصدی شعر و ادب کی روایت قائم کی۔

کتاب کے آخر میں کتابیات شامل ہے جس میں ۴۲ کتابوں کے علاوہ اخبارات، رسائل اور مختلف رپورٹیں اور رودادیں شامل ہیں۔ اس سے موصوفہ کی محنت اور کام کرنے کی لگن کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب میں اشاریے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر وہ بھی شامل ہوتا تو کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا۔

"سندھ میں اردو":

مطبوعہ مقالاتِ تحقیق میں میرے پیشِ نظر اس وقت ایک عمدہ مقالہ ڈاکٹر شاھدہ بیگم کا مقالہ "سندھ میں اردو" برائے پی ایچ ڈی ہے۔ اس مقالے پر کراچی یونیورسٹی نے سنہ ۱۹۷۶ء میں انھیں پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی۔ ملک کے نامور محقق اور نقاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس مقالے کے نگران ہیں۔

یہ مقالہ پہلی بار سنہ ۱۹۸۰ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ درمیانے سائز کے ۳۹۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اسے اردو اکیڈمی سندھ نے شائع کیا ہے۔ مقالہ نگار نے بڑی تحقیق اور کاوش سے عہد قدیم

سے لیکر سنہ ۱۹۶۶ء تک سندھ میں اردو کی ترویج و ترقی کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اور صلاح‌الدین احمد صاحب کی تعارف اور ابتدائیہ کے عنوان سے دو تحریریں شاملِ کتاب ہیں جن میں بجا طور پر مصنفہ کی کوششوں کو سراہا گیا ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالے کو دس ابواب میں عنوانات اور ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب تمہید کے طور پر ہے اس میں سندھ کے تاریخی، تہذیبی اور لسانی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے اور اس ذیل میں بہت سے مباحث زیر بحث آگئے ہیں۔ مثلاً قدیم ترین تہذیبی مرکز اور اس کی روایات، مروّجہ زبانیں اور ثقافتی سرمایہ، عربوں کی آمد کے تہذیبی اثرات، مسلم ثقافت کی ابتدا اور اس کے مقامی زبانوں پر اثرات جس سے مستقبل میں ایک انجانی زبان کے الفاظ وجود میں آئے۔ سندھ میں جس طرح حکومتیں بدلتی رہیں وہاں ثقافتی و لسانی تغیرات بھی وقوع پذیر ہوئے اور عربی، فارسی لسانی طور پر قبول کرلی گئیں۔ مغلوں اور کلہوڑوں کے دور حکومت میں اردو کے خال و خد ابھر کر سامنے آئے۔ سندھ میں دکن اور دلی کے دوش بدوش متحد زبان کے شاعر پیدا ہوتے رہے۔ باب اوّل کے آخری حصے میں موصوفہ نے قیام پاکستان میں اہلِ سندھ نے جس جوش و خروش سے حصہ لیا اس کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ قائداعظم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے شاہدہ بیگم رقم طراز ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں میں ایسا اتحاد پیدا کردیا تھا کہ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے اس اتحاد میں اردو نے وہی کام سندھ میں بھی کیا، جو ہندستان کے دیگر علاقوں میں کیا تھا۔

باب دوم میں سندھ میں اردو کے ابتدائی نقوش و آثار، تاریخ کی تدریجی ترقی کے ساتھ اردو الفاظ کے استعمال، دکن، پنجاب اور سواحل ہند میں مروج مماثل الفاظ، اور سندھی سے اردو کی لسانی ہم آہنگی اور صوتیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اسی باب میں موصوفہ نے ملک کے ماہرین لسانیات و اساتذہ کی اردو کے مولد و منشا کے بارے میں آرا بڑی تفصیل اور شرح و بسط سے پیش کی ہیں۔

ماہرین لسانیات اور علماء میں انشاء، محمد حسین آزاد، نساخ، محمود خان شیرانی، زور، چٹرجی، سید سلیمان ندوی، مسعود حسین خان، شوکت سبزواری، علامہ آئی آئی قاضی، پیر حسام الدین راشدی وغیرہ کی آراء دور بہ دور پیش کر کے ڈاکٹر شاہدہ بیگم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو زبان کے تدریجی ارتقا کا پس منظر سینکڑوں سال پر محیط ہے جو زمان و مکاں کا پابند نہیں۔ اردو کا رشتہ سندھ سے بہت قدیمی ہے۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہوئی اور میل جول کی وجہ سے زبان میں تبدیلیاں آتی رہیں اور مختلف زبانوں کے الفاظ اردو زبان میں جذب ہوتے رہے۔ اس زبان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو لفظ اس زبان میں داخل ہوا اس کو وہ اپنا کر لیتی ہے۔ اسی صورت سے ایک لسانی ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ تمام علاقائی زبانوں میں کم و بیش ایسے لفظ موجود تھے جو سارے ملک کی ایک مشترک زبان کا ناگزیر تقاضا بن گئے۔ تفصیلی بحث کے بعد محترمہ نے اردو اور سندھی کو سگی بہنوں کا درجہ دیا ہے۔ دونوں ہند آریائی زبانیں ہیں۔

تیسرا باب سندھ میں اردو کے سرپرست خانوادوں کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ ان میں سومرہ، مغلیہ، کلہوڑہ، اور تالپور خاندان سر فہرست ہیں۔ اس کے علاوہ صوفیائے کرام اور دینی مدارس نے

جس طرح اردو کی ترویج و ترقی میں بھرپور حصہ لیا اس کا مفصل جائزہ ڈاکٹر شاھدہ بیگم نے دوو بہ دور پیش کیا ھے۔ ارغونوں، ترخونوں اور مغلوں کے دور میں اردو کی ابتداھوئی ۔ دکنی دور کی طرح سندھ میں بھی اردو شاعری ھی سے یہ زبان پروان چڑھی۔ مغلیہ دور میں اردو شعر و ادب کی سرپرستی کی گئی۔ اس دور کے مشہور شاعر شاہ کریم بلڑی والے تھے ۔ ان کا زمانہ دکن میں اردو شاعری کے آغاز کا زمانہ تھا۔ سندھ میں اردو کی نمائندگی کے لیے ان کا نام لیا جا سکتا ھے۔ اس کے بعد کلہوڑہ خاندان اور تالپور خاندان نے صحیح معنوں میں اردو کی سرپرستی کی اور شمالی ھندوستان کے متعدد شعرا اور ادیب ان کی داد و دھش سے فیض یاب ھوئے۔ ذیلی عنوان کے تحت موصوفہ نے اردو کی ترقی میں صوفیائے کرام کی کاوشوں پر روشنی ڈالی ھے اور بتایا ھے کہ اردو کے حقیقی سرپرست، ارباب اقتدار سے زیادہ وہ افراد تھے جو اھل اللہ تھے۔ برصغیر ھند و پاک میں خانقاھیں اور تبلیغی مراکز اردو کی پرورش گاہ تھے۔ سولھویں صدی سے لیکر انیسویں صدی عیسوی تک شاید ھی کوئی صوفی شاعر ایسا گذرا ھو جس نے اردو کی طرف توجہ نہ کی ھو۔ ان میں شاہ کریم بلڑی والے، ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی، میر محمود صابر، سچل سرمست، ابو تراب، روحل فقیر، ابراھیم شاہ، غلام مرتضیٰ، سوبھا فقیر، مصری شاہ اور کلیم اللہ شاہ وغیرہ شامل ھیں۔ محترمہ نے اس تحقیق سے یہ نتیجہ نکالا ھے کہ سندھ نے ھر دور میں ایسے باکمال پیدا کیے جو شاعری کی کسی سطح پر بھی دلی اور دکن کے شاعروں سے کمتر نہیں، اور خانقاھوں نے اردو کی وھی خدمت کی جو برصغیر کے دیگر علاقوں میں کی جا رھی تھی۔

چوتھا باب سندھ میں اردو کے علمی و ادبی ذخائر اور رسائل

کے بارے میں ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے بڑی تحقیق ، محنت اور جانفشانی سے صحافت اور پریس ، رسائل ، روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات وغیرہ کا ذکر بالتفصیل کیا ہے۔

سندھ میں سنہ ۱۸۵۴ء تک کسی اخبار کا سراغ نہیں ملتا۔ اسی سنہ میں انگریزی کا پہلا اخبار "سندھین" نظر آتا ہے۔ اس کے بعد متعدد سندھی اخبار نکلے اور اردو کا پہلا اخبار "دور بین" نکلا اس کی تاریخ اجرا اندازاً محترمہ نے سنہ ۱۸۸۳ء کے لگ بھگ بتائی ہے۔ تحقیق میں اندازے سے کام نہیں چلتا اگر محترمہ مزید تحقیق کرکے اس کے سنِ اجرا کا سراغ لگاتیں تو بات مزید وقیع ہو جاتی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں متعدد اخبار، ہفت روزے اور رسالے نکلنے شروع ہوئے۔ ان میں اردو کے اخبارات و رسائل کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ ان رسائل نے جدوجہد آزادی کی شمع کی لو کو تیز تر کر دیا۔ پاکستان بننے کے بعد تو سندھ کا کوئی شہر ایسا نہ بچا جہاں سے اردو کا کوئی رسالہ یا اخبار نہ نکلتا ہو۔ ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے محترمہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ گو اردو اخبارات و رسائل کم تھے اور سندھی کے مقابلے میں اردو کا اشاعتی تناسب قبل تقسیم کچھ نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود جو کچھ تھا غنیمت ہے۔ اسی باب میں ذیلی عنوان کے تحت عوامی اجتماعات اور مشاعروں کی روداد بیان کی ہے۔ انیسویں صدی کی آخری دھائی میں سندھ میں مشاعروں کا رواج ہوا اور اردو کی اشاعت اردو کے عوامی مشاعروں سے ہوئی۔ مشاعروں نے عملی طور پر اردو کی تبلیغی مہم کا کام سرانجام دیا۔ اس باب میں موصوفہ نے مشاعروں کا حال اور مختلف شعرا کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو سندھ میں

عام ہوتی جا رہی تھی۔ سندھ میں انجمن ترقیٔ اردو کا قیام بھی سنہ ۱۹۱۴ء میں عمل میں آیا ، اس کی سرپرستی اکثر عمائدین نے فرمائی ، ان اجتماعی کوششوں سے اردو ہر بڑے شہر میں مانوس حیثیت سے پہچانی جانے لگی۔ مختلف ادبی انجمنیں قائم ہوئیں۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی۔ بیسویں صدی کے وسط تک دو قسم کی انجمنیں موجود تھیں ، ایک قسم وہ جو پرانی ڈگر پر چل رہی تھی، دوسری وہ جو جدت پسند تھی۔ محترمہ شاھدہ صاحبہ نے پھر سندھ کے ہر بڑے شہر کی ادبی روداد بیان کی ہے اور ادیبوں کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ باب کے آخر میں سندھ میں اردو مطبوعات کے ذخیرے پر روشنی ڈالی ہے۔ اور سندھ میں اردو کی قلمی کتابوں کی فہرست بڑی محنت سے تیار کی ہے۔

پانچواں باب ڈاکٹر شاھدہ نے "سندھ میں اردو شاعری قیام پاکستان سے پہلے" کے عنوان سے قائم کیا ہے ، اور ملا عبدالحکیم ٹھٹھوی کو سندھ میں اردو کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ایک لمبی فہرست ان شعرا کی ہے جو سندھی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے رہے۔

چھٹا باب سندھ کے اردو نثر نگاروں کے بارے میں ہے۔ اس میں ان خدمات کا تذکرہ ہے جو قیام پاکستان سے قبل ان ادیبوں نے انجام دیں۔ محترمہ نے سب سے پہلے مول رام مہتہ کا ذکر بحیثیت مترجم کیا ہے۔ اگر موصوف اصل مخطوطے تک رسائی حاصل کر لیتیں تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ مول رام مترجم نہیں بلکہ کاتب ہے۔ یہ اتنا پرانا مخطوطہ ہے کہ ابھی تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ اصل مترجم کون ہے۔ آگے چل کر شاھدہ صاحبہ نے متعدد نثر

نگاروں کے نام اور ان کے کام گنوائے ہیں اور لکھا ہے کہ ان کو سنِ وفات کی ترتیب سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اکثر ادیبوں کا سال وفات و پیدائش دونوں غائب ہیں۔ نثر نگاروں میں میر محمد حسن علی خان، صورت سنگھ صورت بہار، پیر بھاون، سید رشد اللہ شاہ، میرزا قلیچ بیگ، مرزا مدد علی بیگ، میر علی نواز خان، مولوی محمد صادق۔ پیر جمال الدین علوی، مولانا عبید اللہ سندھی، حکیم فتح محمد سیوھانی وغیرہ کے حالات اور اردو تخلیقات کا ذکر اجمالاً کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں حوالوں کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

ساتواں باب سندھ میں اردو شاعری کا ارتقا، قیام پاکستان کے بعد پر مبنی ہے۔ سندھ میں اردو شاعری کا موجودہ دور ادبی تاریخ کا روشن باب ہے۔ سندھی شاعروں اور ادیبوں نے اردو میں مسلسل طبع آزمائی کی اور اردو کے دامن کو اپنی تخلیقات سے مالا مال کیا۔

آٹھواں باب سندھ میں اردو کے نثری اثاثے سے متعلق ہے۔ اس اثاثے میں قیام پاکستان کے بعد بڑی پیش رفت ہوئی۔ سندھی ادب کے شہ پارے اردو میں منتقل ہوئے، ان سے اردو ادب و تاریخ دونوں کو فائدہ پہنچا۔ نثر نگاروں کا تذکرہ اجمالاً کیا گیا ہے لیکن موصوفہ نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان کے کام پر پوری طرح روشنی پڑے۔ ان ادیبوں میں چند یہ ہیں: ابراہیم خلیل، لطف اللہ بدوی، عبدالواحد سندھی، پیر حسام الدین راشدی، غلام احمد بدوی، غلام علی الانا، مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی، مولانا غلام محمد گرامی، رشید احمد لاشاری وغیرھم۔ یہ وہ اہم نام ہیں جنہیں بلا شبہ سندھ میں اردو کے معمار کہا جا سکتا ہے۔ سندھ میں اردو نثر کی قندیل ان ہی کے کارناموں سے روشن ہے۔

نواں باب اردو پر سندھی زبان و ادب کے اثرات پر مبنی ہے

اور یقیناً اس کتاب کا اہم حصہ ہے، سندھی اردو کا جو رابطہ ہے اس سے موصوفہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دونوں زبانوں کی جڑیں ماضی میں ایک نقطے پر مل جاتی ہیں۔ اردو پر سندھی کے اثر کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب سندھی شاعروں نے اردو میں طبع آزمائی کی۔ عوامی میل جول سے سندھی کے اثرات اردو پر واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ عوام میں سندھی کے بہت سے الفاظ اس طرح عام ہو گئے کہ اب وہ اردو ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ سندھی اردو کے مشترک ادیبوں میں اب ایک مشترکہ رجحان تراجم کا پیدا ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے دونوں زبانیں مالامال ہو رہی ہیں۔

ذیلی عنوان کے تحت موصوفہ نے اردو ادب پر سندھی زبان و ادب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اور حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ قدیم دور سے اردو کسی نہ کسی صورت میں سندھی ادب و شاعری پر اثرانداز ہوتی رہی۔ خاص طور سے ڈاکٹر ابراہیم خلیل کے متعدد حوالے اس ثبوت میں پیش کیے ہیں کہ اردو الفاظ مختلف زمانوں میں سفر کرتے ہوئے سندھ پہنچے اور رچ بس کر سندھی زبان کا حصہ بن گئے ان کے متعلق یہ قیاس آرائی کہ وہ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت سے آئے ہیں بالکل خام خیالی ہے۔ سندھی پر اردو کے اثرات اٹھارویں صدی سے پڑنے شروع ہوگئے تھے، مگر زیادہ واضح اور روشن نہ تھے لیکن انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں تو اس میں شدت پیدا ہوگئی اور اس کا آغاز اردو کے مذہبی لٹریچر سے ہوا، اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھی زبان و ادب پر مذہبی گرفت خاصی مضبوط ہے۔ ابتدائی شاعری ہو یا نثری ادب، صوفیانہ انداز دونوں میں نمایاں ہے۔ سر سید تحریک کے

زیر اثر بھی وھاں بہت کام ھوا اور سیرۃالنبی صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد کتابیں لکھی گئیں - شاھدہ صاحبہ نے اس باب کے آخر میں سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کو خراج تحسین پیش کیا ھے کہ یہاں متعدد مقالے اس ضمن میں لکھوائے گئے - اردو کتابوں کے تراجم سو سے بھی تجاوز کرگئے - ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ھوئے محترمہ نے نتیجہ اخذ کیا ھے کہ سندھی نثر و نظم پر اردو کے بنیادی اثرات مسلم ھیں - محترمہ ثریا بیگم نے یہ مقالہ بڑی محنت اور لگن سے لکھا ھے - یقیناً اس موضوع پر ایک کامیاب کوشش ھے اور آئندہ لکھنے والوں کے لیے خاصا ٹھوس مواد مہیا کرتی ھے اور اردو زبان کے ارتقا کے ساتھ ساتھ سندھ میں مسلم تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالتی ھے - مگر کتابیات اور اشاریے کی کمی محسوس ھوتی ھے - جدید تصانیف میں کتابیات اور اشاریے سے استفادے میں بڑی سہولت حاصل ھوجاتی ھے - کتاب کی اگلی اشاعت میں کتابیات اور اشاریے کا اضافہ کردیا جائے تو کام کرنے والوں کے لیے آسانیاں فراھم ھو جائیں گی -

پاورقی حوالوں میں اکثر جگہ ثانوی ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ھے - اگر بنیادی ماخذوں سے استفادہ کیا جاتا تو کتاب کی تحقیقی حیثیت میں مزید اضافہ ھو جاتا -

"دیوان- تراب"

شاہ تراب علی تراب بیجاپوری بارھویں صدی ھجری کے نامور صوفی شاعر تھے - دکن میں چشتیہ سلسلے کی ایک اھم کڑی سمجھے جاتے ھیں - ان کا دیوان جس کا واحد نسخہ کتب خانہ انجمن کراچی میں موجود ھے ' ڈاکٹر سلطانہ بخش نے اپنے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ

مرتب کیا ہے اور اسے انجمن ترقیٔ اردو پاکستان نے ۱۹۸۲ء میں شایع کیا ہے۔

ڈاکٹر سلطانہ بخش پاکستانی خواتین محققین میں اردو تحقیق کا صحیح مذاق رکھتی ہیں۔ کتاب کا مقدمہ بتاتا ہے کہ اصولِ تحقیق سے اچھی واقفیت ہے۔ موصوفہ "اردو تحقیق کے اصول" پر ایک کتاب بھی مرتب کر چکی ہیں۔ اس سے بھی تحقیق کے موضوع سے ان کی دلچسپی اور کارآمد آگہی ظاہر ہے۔

دیوانِ تراب کے متن کی تدوین اور اس کا مقدمہ اور ضمیمے جو آخر میں شامل ہیں یہ سب تحسین کے لائق ہیں۔ ایسے قدیم مخطوطات کا جن کا صرف ایک ہی نسخہ موجود ہوتا ہے (جیسا کہ دیوان ہو تراب کا واحد نسخہ انجمن ترقی اردو میں موجود ہے) صحیح پڑھنا اور تدوین کے تمام تقاضے پورا کرنا ایک مشکل کام بن جاتا ہے کیونکہ الفاظ کی تصحیح کے لیے کوئی اور نسخہ سامنے نہیں ہوتا، یہی دشواری ڈاکٹر سلطانہ بخش کو بھی پیش آئی، لیکن ہمارے خیال میں اس محنت طلب کام کو انھوں نے پوری علمی احتیاط اور قابلیت سے مکمل کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ کا مقدمہ ایک علمی کارنامہ ہے۔ انھوں نے شاہ تراب کے متعلق نہایت گراں قدر معلومات بہم پہنچائی ہیں، بلکہ اس پورے عہد پر روشنی ڈالی ہے۔ شاہ تراب مدراس کے علاقے ترنامل کے رہنے والے تھے۔ بیجاپور آکر پاشا حسینی کے مرید ہوگئے اور وہیں قیام کیا۔ اُن کا تعلق سلسلۂ چشتیہ سے تھا اپنے پیر کے حکم پر واپس ترنامل آئے اور سلسلۂ تصوف کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہوگئے۔ اب تک شاہ تراب کی تاریخ پیدائش پر بحث ہوتی رہی تھی۔ مگر محترمہ ڈاکٹر صاحبہ نے اس دیوان کی

داخلی شہادت سے اُن کا سال پیدائش ۱۱۳۰ھ متعین کیا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے شاہ تراب کی تصنیف "من سمجھاون" میں ان کی ایک اور تصنیف "گیان سروپ" کے ایک مخطوطے مکتوبہ ۱۱۲۱ھ کی بنیاد پر شاہ تراب کا سال ولادت ۱۱۰۴ھ قرار دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر سلطانہ بخش نے شاہ تراب کا سالِ پیدائش قطعیت کے ساتھ ۱۱۳۰ھ متعین کردیا۔ شاہ تراب ایک عالم، صوفی اور شاعر تھے۔ توکل، درویشی، رضا اور صبر ان کی فطرت تھی۔ ان کا دیوان شروع سے آخر تک تصوف کے اسرار و رموز پر مبنی ہے۔ وہ مکمل طور پر صوفی شاعر ہیں۔ انھیں فارسی، عربی، اردو، مرہٹی تمام زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ علم رمل، حکمت، نجوم، ہئیت و فلسفہ میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے ان کے پیر و مرشد نے انھیں گنج الاسرار کا خطاب دیا تھا۔

دیوان تراب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں معاشرتی بدحالی عام تھی۔ انگریز اپنے قدم ہندوستان کی سرزمین پر جما رہے تھے۔ سلطنت مغلیہ کے چراغ کی لو بھڑک اٹھی تھی۔ بیرونی حملے، اندرونی فساد و معاشی انحطاط اور معاشرتی زوال نے ایک عام بےچینی پیدا کر دی تھی۔ میر، سودا، حاتم نے بھی اس دور میں شہر آشوب لکھ کر اپنی بے چینی کا اظہار کیا ہے۔ ان تمام شعرا کا انداز بیان ایک سا ہے اس وقت سارے برعظیم کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات یکساں تھے۔ ان ہی کا بیان مختلف انداز میں تمام شعراء نے کیا ہے۔ بادشاہوں میں عدل و انصاف نہیں، قاضی، مفتی و اہلکار، رشوت خور چور ہو گئے ہیں، رذالوں کا دماغ آسمان پر ہے۔ نجیب زادیاں برقع پہنے بھول سا بچہ گود لیے ہر آنے جانے والے سے خاک پاک کی تسبیح بیچنے کے بہانے بھیک

مانگ رہی ہیں۔ بے روزگاری عام ہے۔ امراء اس حد تک بد دل ہوئے ہیں کہ وہ سیاست سے گریز کرنے لگے ہیں۔ غرض، شمالی ہندوستان ہو یا جنوبی ایک حالت سے سب گذر رہے تھے۔ شاہ تراب نے بھی مسلمانوں کی بربادی و تباہی انگریزوں کے مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھے سو وہ ان کے حساس دل پر اثر انداز ہوکر شعر کی صورت میں ڈھل گئے۔ ان کے دیوان میں محترم سلطانہ بخش صاحبہ نے جگہ جگہ ایسی غزلوں کی نشان دھی کی ہے۔ حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ شاہ تراب کا دل دنیا سے اچاٹ ہوگیا اور انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ مقدمے کا دوسرا باب ڈاکٹر صاحبہ نے شاہ تراب کی تصانیف کے لیے مختص کیا ہے۔ اور تمام معلوم تخلیقات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ فرماتی ہیں کہ شاہ تراب کی تمام تخلیقات میں سب سے اہم دیوان ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اہم تصانیف "ظہورِ کلی"، "من سمجھاون"، "گلزارِ وحدت"، "گنج الاسرار"، "قصہ جبیں و ملا"، "گیان سروپ"، "آئینہ کثرت"، اور "مثنوی رام چندر و دلارام" ہیں۔

مقدمے کا تیسرا باب "فلسفہ تصوف" پر مبنی ہے۔ اس میں موصوفہ نے نہایت عمدہ طریقے سے خانوادۂ شمس العشاق کے مخصوص فلسفۂ تصوف (جو سلسلۂ امینیہ کے نام سے مشہور ہے) پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا طریق چشتیہ تھا اور بیجاپور میں بہت مقبول تھا۔ برہان الدین جانم نے مسلک طریقت سمجھانے کے لیے ویدانت کی اصطلاحیں ہندو مذہب اور دیو مالا کی بعض علامتیں بھی استعمال کیں امین الدین علی اعلیٰ نے اس نظام سلوک کو مربوط کرکے جامع اور مرتب انداز میں پیش کیا۔ اس فلسفے کو بالتفصیل بیان کرکے محترمہ اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ شاہ تراب کی شاعری میں

سلسلہ امینیہ کے تصوف کے اثرات ہیں اور انہوں نے اس سلسلے کو اپنے کلام کے ذریعے بڑھایا اور پھیلایا ہے۔

موصوفہ نے مقدمے کے چوتھے حصے میں شاہ تراب کے پیش کردہ مخطوطے کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے وہ فرماتی ہیں کہ یہ مخطوطہ دنیا کا واحد معلوم نسخہ ہے اور انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی میں محفوظ ہے، نسخہ کرم خوردہ ہے۔ اس کے بعد ان مشکلات کا تذکرہ ہے جو اس نسخے کو پڑھنے اور دیوان کے متن کو تیار کرنے میں درپیش ہوئیں۔ محترمہ نے تدوین کے تمام تقاضے پورے کیے ہیں۔ قدیم دکنی الفاظ کا املا غور طلب ہوتا ہے اس لیے ڈاکٹر سلطانہ بخش نے آخر میں فرہنگِ الفاظ دے کر اس دشواری کو بھی دور کردیا ہے۔

مقدمے کے آخر میں ان مخطوطات اور کتابوں کی تفصیل بھی موجود ہے جن کے حوالے مقدمے میں دیے گئے ہیں۔ یہ کتابیات مجموعی حیثیت سے مقدمہ نگار کے ذوقِ تحقیق اور محنت کی آئینہ دار ہے گوکہ اس میں کہیں کہیں ثانوی ماخذ سے کام چلایا گیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب کی کتاب "علمی نقوش" جس کا حوالہ اصل کتاب کے بجائے ایک اور کتاب سے نقل کیا ہے اسی طرح "رسالہ وجودیہ" کا حوالہ بھی ایک ثانوی ماخذ سے لیا ہے۔

موصوفہ نے حواشی نگاری اور کتابیات میں بھی مروج طریقوں کا لحاظ نہیں کیا۔ چنانچہ یکسانی مفقود ہے۔ کہیں تو حوالہ مصنف کے نام سے شروع ہوتا ہے اور کہیں کتاب کے نام سے۔ بہر کیف یہ چند ایک جزوی باتیں ہیں۔ ان کا کام بلاشبہ مجموعی لحاظ سے عمدہ ہے۔

"اردو کی علمی ترقی میں سرسید اوران کے رفقائے کار کا حصہ":

ڈاکٹر امت الحمید کوثر کا تحقیقی مقالہ "اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کا حصہ" کے موضوع پر چھپ کر سنہ ۱۹۸۴ء میں سامنے آیا ہے۔ اس مقالے پر موصوفہ کو پی ایچ ڈی کی سند سنہ ۱۹۸۰ء میں کراچی یونیورسٹی نے عطا کی۔ یہ مقالہ ۴۴۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اسے لائبریری پروموشن بیورو نے شائع کیا ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالے کو چھے ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب اپنے عنوان اور ذیلی عنوانات کے تحت نہایت مفصل ہے۔

باب اول سر سید سے پہلے اردو علمی ورثے سے متعلق ہے اس میں موصوفہ نے اردو کی ابتدا، اردو پر مذہب کے اثرات، غیر ملکی اردو مصنفین، فورٹ ولیم کالج، دھلی کالج وغیرہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ محترمہ کوثر صاحبہ نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے مواد کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے بلاشبہ یہ تفصیلات بہت اہم ہیں مگر اس ضمن میں ایسے بہت سے موضوعات کی تفصیل آگئی ہے جو اصل عنوان سے زیادہ ربط نہیں رکھتے، اگر اختصار اور اجمال سے کام لیا جاتا تو مقالے کی قدر و قیمت میں مزیداضافہ ہوجاتا۔

باب دوم "سر سید تحریک کا سیاسی اور تہذیبی پس منظر" کے عنوان سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس میں موصوفہ نے سر سید کے عہد سنہ ۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۹ء کا ایک مکمل اور بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ اس عہد کے ہر ہر پہلو پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی

ھے۔ برصغیر پاک و ھند کے اس دور میں انگریزوں کے مظالم، زرکشی، بد عہدی، مسلمانوں کے ساتھ بدترین سلوک اور ھندوؤں کی سرپرستی کا مکمل احوال درج ھے۔ اس دور کے خاص خاص نکات یہ ھیں: انیسویں صدی دراصل بحث و مناظرے کی صدی تھی اس میں مشرق و مغرب، قدیم و جدید، بدعت و سنت، شاھی و جاگیرداری، مذھب و سائنس، غرض ھر شعبۂ زندگی میں ایک تصادم نظر آتا ھے۔ ھندوستان میں اسلامی سلطنت کے اثرات دور کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کے دینی اور مذھبی احساس کو مٹادیا جائے تا کہ ان کی سیاسی یک جہتی ختم ھوجائے۔ اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لارڈ میکالے نے نئی تعلیمی پالیسی وضع کی۔ اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانا تو مشکل بلکہ ناممکن ھے مگر انھیں مسلمان بھی نہ رھنے دیا جائے۔ اس طرح وہ انگریزوں کے زیادہ وفادار رھیں گے۔ آھستہ آھستہ مدارس ختم کردیے گئے۔ مسلمان ھر طرح برباد ھوگئے۔ اسلامی خصوصیات سے محرومی نے ان میں انفرادی و اجتماعی اوصاف کا خاتمہ کردیا۔ اور من حیث القوم ان کے مٹ جانے کا خدشہ پیدا ھوگیا۔ ان حالات میں سر سید احمد خاں مسلمانوں کے لیے رحمت خداوندی بن کر ابھرے۔ سر سید احمد خاں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ انتہائی حساس دل کے مالک تھے۔ مسلمانوں کی تباھی نے انھیں ھلا کر رکھ دیا تھا۔ ان کے اندر خود اعتمادی کا جوھر قوم کی سچی ھمدردی اور بہتری کا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ عزم بالجزم کے قائل تھے۔ اس قدر نامساعد حالات میں بھی انھوں نے رسالہ اسباب

بغاوت ہند لکھ کر جرات مومنانہ کا ثبوت دیا۔ اور انگریزوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی کریں۔ سر سید نے مسلمانوں کی سیرت کی تشکیل کے لیے علمی انقلاب کی تحریک کا بیڑا اٹھایا، تا کہ مسلمان تعلیمی اور اقتصادی میدان میں ترقی کریں۔

تیسرا باب "سر سید احمد خان کی علمی تحریک کے مقاصد اور طریقہ کار" پر روشنی ڈالتا ہے۔ موصوفہ نے سر سید کے کارناموں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان کا الگ الگ جائزہ لیا ہے۔ اور ان ذیلی عنوانات کے تحت ان پر بحث کی ہے۔

۱۔ سر سید احمد خان کی علمی تحریک کے مقاصد اور علمی طریق کار۔

۲۔ سر سید احمد خان کی علمی تصانیف و تالیفات اور مقالات و خطبات۔

اس سلسلے میں سر سید کی جامع الحیثیات شخصیت کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت، خاندانی پس منظر، ملازمت، جدید تعلیم کی اہمیت، ان کی ابتدائی تصانیف، ان کے خیالات اور تحریروں کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد سر سید کی علمی تحریک کے معاشرتی مقصد پر بحث کی ہے اور اس کے عملی طریقہ کار کی مکمل روداد پیش کی ہے کہ کس طرح سر سید نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا ذوق بیدار کیا اور اس کے لیے کن طریقوں سے کام لیا، مدرسے قائم کیے، اخبار نکالے، رسالے جاری کیے، علمی انجمنیں قائم کیں، سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور اس کے تحت ایک اخبار انسٹیٹیوٹ گزٹ جاری کیا۔ اس اخبار نے بھی مسلمانوں کی حالت بدلنے میں بڑا

کام کیا۔ اس کے علاوہ اردو کو علمی زبان بنانے میں مدد کی۔ موصوفہ نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اس اخبار اور سوسائٹی کی بدولت برصغیر میں علمی ترقی ہوئی اور سیاسی شعور عام ہوا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ پھر سر سید کی کوششوں سے مدرسۃ العلوم کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی مکمل روداد کوثر صاحبہ نے جزئیات کے ساتھ تحریر کی ہے۔ چھوٹی اور معمولی باتوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا اور اس دور کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

باب چہارم سر سید کے علمی کارناموں سے متعلق ہے۔ سرسید نے اردو کو علمی زبان بنانے اور اس کو صحیح مقام دلانے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے نہ صرف قدیم انداز بدلا بلکہ جدید اور عام فہم سلیس و رواں طرز نگارش عام کیا۔ اردو زبان کو اظہار کا وسیلہ بنایا اور اپنی تصنیفات و مقالات کی صورت میں علمی و فکری موضوعات و رجحانات کو اپنی تحریروں میں سمویا۔ موصوفہ نے سر سید کے سیاسی، تہذیبی، تعلیمی، اصلاحی، مذہبی، تاریخی خیالات، مضامین اور مختلف تصانیف زیر بحث لا کر ان پر تبصرہ کیا ہے۔ اس باب کا عنوان تو "سر سید کے علمی کارنامے" ہے مگر محترمہ نے اس کے علاوہ بھی جہاں سے جو کچھ ملا، سب کو شامل اشاعت کرلیا۔ جن باتوں کا تذکرہ باب سوم میں کیا گیا تھا ان ہی کا ذکر پھر باب چہارم میں کیا گیا ہے۔ جو کتاب کے حجم میں اضافے کا سبب ہوا ہے۔ اسی باب میں تعلیم نسواں کے بارے میں سر سید کے خیالات بیان کیے ہیں اور خاصا ہمدردانہ تجزیہ کیا ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہے اور غور کرتے رہے کہ ہمارے معاشرے میں عورتوں کے لیے تعلیمی نصاب کیا

ہو اور کیسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں باپردہ رہ کر خواتین تعلیم حاصل کر سکیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ پہلے لڑکے تعلیم یافتہ ہو جائیں تو از خود لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ہوجائے گا۔ جس قوم کے مرد لائق ہوتے ہیں اس کی خواتین از خود تعلیم یافتہ ہو جاتی ہیں۔ سر سید ان لوگوں میں سے تھے جو ساری دنیا کے علوم سمیٹ کر اپنی قوم کی جھولی میں بھردینا چاہتے تھے۔ تعلیم عام کرنے کے لیے انھوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ سر سید چاہتے تھے کہ اسلامی تہذیب کے صالح عناصر اور نئی تہذیب کے محاسن کے عمدہ امتزاج سے ایک ایسا معاشرہ تشکیل پائے جو زندگی کے جدید تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔

اس کے بعد موصوفہ نے "خطبات احمدیہ" پر مکمل، مفصل اور بھرپور تبصرہ کیا ہے اور تجزیہ کرکے ثابت کیا ہے کہ انھوں نے تن تنہا وہ کام کر دکھایا جو کسی ایک کے بس کا نہ تھا۔ تمام اصنافِ علم و ادب پر ان کی تقریر و تحریر کے گہرے اثرات ہیں۔ زندگی کے تمام شعبہ ہائے فکر کو انھوں نے متاثر کیا۔ اگلے صفحات میں موصوفہ نے ایک دفعہ پھر ہندی اردو جھگڑے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے پہلے باب میں گو یہ بحث خاصے طویل انداز میں تحریر کی جا چکی تھی۔ اس کے بعد پھر تہذیب الاخلاق کا ذکر ہے۔ یہ بھی پچھلے صفحات میں زیر بحث آچکا تھا۔ تکرارِ مضمون سے قاری کو پڑھنے میں خاصی الجھن ہوتی ہے۔ اسی باب میں سر سید کی صحافت میں دلچسپی اور ان کے عقلی و تجرباتی اصولوں پر بحث ہے۔ تاریخ سے سر سید کا لگاؤ اور ان کی کتابوں پر بھرپور تبصرہ ہے۔ اور محترمہ نے اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ سر سید اسلام کے سنہری دور کو یاد دلا کر اس کی عظمت رفتہ کو واپس لانا چاہتے ہیں۔

ان کے خیالات و افکار سب کا مقصد اور نصب العین قوم کی فلاح و بہبود اور اس کی سرفرازی ہے۔ سر سید کی عملی تحریک کے اثرات اتنے گہرے، اتنے وسیع اور موضوعات زندگی پر محیط ہیں کہ ان سے متاثر ہوکر اردو نثر نگاری نے بھرپور ترقی کی اور ان کی بدولت علم دوست اصحاب کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے اردو کی تحریک کو پروان چڑھانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

باب پنجم "سر سید کے رفقائے کار کی علمی خدمات" پر مبنی ہے۔ سر سید کے قریبی ساتھیوں میں مولانا حالی، مولانا شبلی، محسن الملک، وقارالملک، چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد اور ذکاءاللہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سب سے اہم نام مولانا حالی کا ہے۔ سر سید کی طرح ان کا دل بھی قومی ہمدردی سے معمور تھا۔ محترم کوثر صاحب نے تقریباً تیس صفحات پر مشتمل جائزے میں حالی کی تصنیفاتِ نظم و نثر پر مفصل بحث کی ہے۔ حالی سر سید سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ اور ان کی تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے مسلمانوں کے تنِ مردہ میں جان ڈال دی۔ بہ طورِ خاص "مسدس حالی" نے قوم کے قلب و نظر کو متاثر کرنے میں بڑا کام کیا۔ حالی اس میدان کے آدمی تھے جس کے لیے سر سید تگ و دو کر رہے تھے۔ انھوں نے سرسید کا اثر پوری طرح قبول کیا۔ حالی نے اردو ادب میں تنقید اور سوانح نگاری کی بنیاد رکھی۔ وہ جدید اردو شاعری کے بانیوں میں سے تھے۔ اصولِ نقد متعین کیے اور اپنے دیوان پر مقدمہ لکھا جو "مقدمہ شعر و شاعری" کے نام سے کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔ اور آج بھی وہ فن تنقید میں خشتِ اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا حالی بھی تعلیم نسواں کے حامیوں میں سے تھے۔ لیکن ان کی رائے اس بارے میں

سر سید سے مختلف تھی۔ وہ مرد عورت دونوں کے لیے تعلیم ضروری سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عورتوں کے نصاب کے لیے ایک کتاب " مجالس النساء " لکھی، جس پر ۱۸۷۵ع میں انھیں چار سو روپیہ انعام ملا تھا۔ اور یہ کتاب اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک رائج رہی۔ اس موضوع پر قلم اٹھانے والا کوئی مصنف اس اہم کتاب کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ گارسیں دتاسی نے اپنے مقالات حصہ دوم ۱۸۷۴ع میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب نے اپنی تصنیف "حالی کا ذہنی ارتقا" میں اس کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس ضمن میں مجالس النساء کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی جاتی تو بات وقیع ہوجاتی۔ مجالس النساء میں ان باتوں کو موضوع سخن بنایا ہے جن کا تعلق اسلامی نصب العین، افادیت، مقصدیت اور رفاہ عام سے ہے۔ حالی نے ان تمام گوناگوں مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جن میں ۱۸۵۷ع کے بعد مسلمان گھرانے مبتلا تھے۔ یہ کتاب اس دور کی قومی اور تعلیمی تحریک کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

موصوف نے بڑی تفصیل سے حالی کے افکار، خیالات اور تصانیف پر روشنی ڈالی ہے اور علمی ترقی کے سلسلے میں ان کی قابل قدر کاوشوں اور جدوجہد کا اعتراف کیا ہے۔

دبستانِ سر سید میں شبلی کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے محمد فاروق چریا کوٹی سے حاصل کی۔ منطق سے انھیں خاص دل چسپی تھی۔ منطقی انداز آخر تک ان کی تحریر و تقریر میں برقرار رہا۔ موصوف نے مولانا شبلی کی علی گڑھ آمد، سر سید کی علمی صحبت، آرنلڈ کی رفاقت، قدیم علوم کی فضیلت

اور جدید علوم کی افادیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ مولانا شبلی کی ذہنی تشکیل میں علی گڑھ تحریک کے نمایاں کردار اور قدیم طرز فکر میں تبدیلی کا جائزہ پیش کیا ہے۔ مولانا شبلی کی تصانیف کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ مولانا تاریخ و سیر اور تحقیق و تنقید میں درجۂ کمال درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے آزادیٔ فکر کا احساس دلایا اور علمی احساسِ کمتری کو دور کیا۔ جدید علوم کا رابطہ قدیم علوم سے جوڑ کر مسلمانوں کی علمی برتری کو ثابت کیا۔ مولانا سر سید تحریک کے ایک سرگرم کارکن تھے۔ سر سید تحریک کے جتنے اہم رکن اور ستون تھے محسن الملک، وقارالملک، سید چراغ علی، نذیراحمد، ذکاء اللہ، امیر علی سب کی خدمات جلیلہ کا ذکر لگ بھگ سوا سو صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ تمام حضرات کی تصانیف پر بھرپور تبصرہ بھی کیا ہے۔

سر سید کے نظریات و افکار نے حالی کو تنگنائے غزل سے نکال کر قومی شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ مولانا شبلی کو تاریخ کی طرف مائل کیا۔ وقارالملک اور محسن الملک کو جدید نثر نگاری کی طرف متوجہ کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کی توجہ ناول کی طرف مبذول کی۔ مولوی چراغ علی نے علمی اور مذہبی مضامین کے ذریعے ادب میں اپنا مقام بنایا۔ ان تمام حضرات نے سر سید کے زیر اثر اردو کو جدید افکار و نظریات سے روشناس کرایا، بلکہ ادب کے ہر میدان میں ایک نمایاں اور مثبت تبدیلی پیدا کی۔ موصوفہ نے اسی باب میں خاصا طویل حصہ مولانا محمد حسین آزاد کے لیے مختص کیا ہے جبکہ مولانا آزاد تحریکِ سر سید کے رکن کبھی نہیں تھے۔ ان کی علمی ادبی خدمات بلا شک و شبہ سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل

ہیں۔ تاریخ ، تنقید ، لسانیات، تحقیق جیسے علمی موضوعات پر انہیں اردو ادب میں تقدم و فوقیت حاصل ہے۔ انشاپردازی میں کوئی ان کا مد مقابل نہیں۔ ان کی ساری کوششیں انفرادی ہیں۔ سر سید تحریک سے وابستگی کبھی نہیں رہی۔

باب ششم " تحریک سر سید کے اثرات و عواقب " کے عنوان سے ہے۔ اس میں ذیلی عنوان قائم کرکے محترمہ نے اس بحث کو سر سید کے عہد سے آج کے دور تک سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں اردو کے پرانے اور نئے مصنفین کا ذکر آگیا ہے اور اس میں تنقید ، تحقیق ، فرہنگ ، مقدمات ، مقالات، خطوط ، انشاپردازی، صحافت، ظرافت غرض ادب کے ہر پہلو کو لیا ہے اور مختلف اصناف ادب، نظم ہو یا نثر، تنقید ہو یا تحقیق ، مذہب، شاعری ، تعلیم ، طنز و مزاح، صحافت سب کا بھرپور تنقیدی جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ ہمارے ادیب و شاعر ، محقق و نقاد سب کسی نہ کسی طرح تحریکِ سر سید سے متاثر تھے۔ اور اس تحریک کے زیر اثر جو علمی کام کیا گیا، اس کی افادیت و مقصدیت مسلم ہے۔

محترمہ نے اپنی اس محققانہ کوشش سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دبستان سر سید اردو کا کلاسیکی اسکول ہے۔ جس نے اردو زبان و ادب کا ہمیشہ کے لیے ایک سنجیدہ اور متوازن معیار قائم کیا۔ پچھلے سو برس میں سر سید اور ان کے رفقائے کار نے جس طرح اردو کو ایک علمی زبان بنادیا ، مستقبل میں بھی ان کے اثرات اردو زبان و ادب پر ہمیشہ قائم رہیں گے۔

کتاب کے آخر میں کتابیات شامل ہے جس میں ۱۷۶ کتابوں کا ذکر ہے، اس کے علاوہ ۲۸ اردو رسائل اور دو اردو روزناموں کا

ذکر ہے۔ اشاریہ بھی موجود ہے۔ اتنی عمدہ کتابیات موصوفہ کی علم سے لگن اور محنت کی آئینہ دار ہے۔

اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ:

مطبوعہ مقالاتِ تحقیق میں ایک عمدہ تحقیقی مقالہ ڈاکٹر رضیہ نور محمد کا مقالہ برائے پی ایچ ڈی "اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" ہے۔ اس پر ۱۹۷۶ء میں پنجاب یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ اس کے نگراں ملک کے مشہور محقق ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ یہ پہلی بار ۱۹۸۵ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ بڑے سائز کے ۳۲۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں (اردو زبان و ادب سے متعلق) مستشرقین کی علمی خدمات کو موضوع تحقیق بنایا ہے اور ۱۴۹۸ء تا ۱۹۴۷ء تک کے طویل عرصے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالے کا خاکہ ساڑھے چار سو سال کی مستشرقین کی خدمات کا عمدہ طور پر احاطہ کرتا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے اس تحقیقی مقالے کو دس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول پس منظر کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس باب میں اجمالی طور پر اردو زبان کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انگریزوں کی آمد سے قبل اردو ایک مستند زبان کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ اقوام مغرب کے نزول کے ساتھ ساتھ لسانی پیکر میں نمایاں تبدیلی آئی اور اس کا اثر زبان کے سانچے اور ذخیرۂ الفاظ پر بھی پڑا۔ دوسرے باب میں اہل یورپ کی آمد اور زبان و ادب سے ان کی دل چسپی دکھائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ پادریوں نے اردو زبان کو عیسائیت کی

تبلیغ کے لیے استعمال کیا۔ اس کے ثبوت میں مقالہ نگار نے متعدد مستند حوالے دیے ہیں۔ اس کے بعد تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ یورپ میں مشرقی زبانوں اور علوم کی مقبولیت اٹھارھویں صدی عیسوی میں شروع ہوچکی تھی لیکن اردو ادب کا ذوق و دلچسپی لارڈ کلائیو (۱۷۶۱ء) وائسرائے ہند کے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ تیسرا باب ایسٹ انڈیا کمپنی اور اہل یورپ کی خدمات کے لیے وقف کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اٹھارویں صدی کا سب سے اہم کارنامہ گلکرسٹ کی اردو خدمات ہیں جو اس نے فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں انجام دیں۔ چوتھے باب میں مقالہ نگار نے فورٹ ولیم کالج اور اس کی ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس باب میں مصنفہ نے تین پہلوؤں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

۱۔ فورٹ ولیم اور ہیلی بری میں اردو زبان و ادب
۲۔ یورپ کے اداروں میں مشرقی زبانوں کی تدریس
۳۔ عیسائی مشنریوں کی اردو زبان میں تبلیغ

ان پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے مس رضیہ نور محمد نے دیگر اعلیٰ پائے کے مصنفین کے حوالوں سے اپنے مقالے کی وقعت میں اضافہ کیا ہے۔ پانچواں اور چھٹا باب یوروپین مستشرقین کی اردو خدمات کے بارے میں ۱۶۳۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ایک جائزہ پیش کرتا ہے۔ ساتواں باب گارسیں دتاسی کی ادبی خدمات کے بھرپور ادبی جائزے پر مشتمل ہے۔ گارسیں دتاسی اردو کا وہ عاشق ہے جس نے اردو کے مولد پر کبھی قدم نہیں رکھا مگر سات سمندر پار فرانس میں بیٹھ کر وہ خدمات انجام دیں جو ہندوستان میں رہنے والے یوروپین مصنفین کو نصیب نہ ہوسکیں۔ یورپ کے مستشرقین میں

تنہا گارسیں دتاسی وہ عالم ہے جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف اردو کے لیے مخصوص رکھا۔ مصنفہ نے دتاسی کی تصانیف کی مکمل اور جامع فہرست پیش کی ہے اور گارسیں کو قدیم و جدید کے درمیان رابطے کی ایک کڑی بتایا ہے۔

آٹھواں باب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں مقالہ نگار نے ہندوستان کی مجموعی حالت پر روشنی ڈالی ہے اور دکھایا ہے کہ انگریزوں کے قدم جمتے ہی علم دوستی کی جگہ مغرب پرستی کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ لیکن اس دور میں بھی کرنل سر ہنری پول مصنف (ہابسن جابسن)، جان بیمز مصنف "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ"، ایڈورڈ ہنری پامر، ڈاکٹر ولیم ہوئی وغیرہ سرگرم نظر آتے ہیں۔

اگلے باب میں پنجاب میں مستشرقین کی خدمات ۱۸۴۷ء سے ۱۹۰۰ء تک پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سرفہرست محکمۂ تعلیم کے افسران بالا فلر، ہالرائیڈ اور لائٹنر کی خدمات جلیلہ ہیں۔ ان حکام نے ادبی سرگرمیوں کو تیز کرنے میں مقامی مصنفین کی مدد کی اور لسانیات کی تحریک کو خاص طور پر فائدہ پہنچایا۔ اورینٹل کالج اور انجمن پنجاب کا قیام انھی کی کوششوں سے عمل میں آیا اور اس انجمن کے مشاعروں نے اردو شاعری کا قالب بدل دیا۔

دسواں باب "مستشرقینِ اردو ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک" ہے۔ ان میں مشہور ماہرینِ لسانیات جارج گریرسن، جان پلیٹس اور گراہم بیلی بہت اہم ہیں۔ ان کی خدمات کا عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔ کلکتہ، دھلی، پنجاب اور بیرونِ برصغیر کے مختلف ادبی رویوں کی دریافت میں ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد نے ایک دل چسپ اور پرمغز تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر مس رضیہ نورمحمد نے اپنے مقالے میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ اس حقیقت کا سراغ لگایا ہے کہ یوروپین اقوام کی آمد اور قیام کس حد تک اردو ادب پر اثر انداز ہوئے۔ مستشرقین کی علمی، ادبی اور تحقیقی کاوشوں سے اردو کے علمی سرمائے میں جو اضافہ ہوا اس کو تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر رکھ کر محترمہ نے اپنے مقالے میں پیش کردیا اور یہ نتائج اخذ کیے :

۱۔ مستشرقین نے زبان و ادب کے بعض میدانوں مثلاً قواعد اور لغت میں پیش رفت کرکے اردو کو علمی لحاظ سے باثروت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

۲۔ کلاسیکی کتابوں کی تدوین کا نیا معیار مقرر کیا۔

۳۔ زبان و ادب کے معیاروں کو اس جانفشانی سے پیش کیا کہ آج کوئی لغت نویس، کوئی قواعد نویس، کوئی نقاد، کوئی تاریخ ادب کا لکھنے والا ان غیر ملکیوں کے کارناموں کو نظرانداز کرکے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

مس رضیہ نورمحمد نے اپنے ماٰخذ اور مصادر کے حوالے دے کر مقالے کو وقیع بنادیا ہے۔ عمدہ کتابیات بھی شامل ہے جس میں اکیانوے اردو کی کتابیں اور ۵۶ انگریزی کتابیں اور ان کے علاوہ ۳۵ رسائل بھی شامل ہیں، جس سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ اپنے تحقیقی کام کو موصوفہ نے دل چسپی، محنت اور لگن سے سرانجام دے کر ایک عمدہ معیار قائم کیا ہے۔ کتابیات میں ایک قابل لحاظ تعداد ثانوی ماٰخذ کی بھی نظر آتی ہے، جس سے یقیناً ان کی محنت اور مقالے کی ضخامت میں غیر ضروری اضافہ ہوا ہے۔

"اردو گیت":

مطبوعہ مقالات تحقیق میں پروفیسر ڈاکٹر بیگم بسم‌اللہ نیاز احمد

کا تحقیقی مقالہ " اردو گیت " برائے پی ایچ ڈی بھی ہے ۔ اس مقالے پر سنہ ۱۹۷۶ء میں جامعہ کراچی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کی ہے ۔ اس کے نگراں ملک کے مشہور محقق ، ماہر لسانیات ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ہیں۔ یہ پہلی بار سنہ ۱۹۸۶ء میں چھپ کر سامنے آیا ہے ۔ بڑے سائز کے ۸۴۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔ اس میں اردو گیت کا تاریخی ، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے ۔ گیتوں پر بحث ہندوستان کے زمانۂ ماقبل سے شروع کی گئی ہے اور سنہ ۱۹۷۴ء تک ان کا احاطہ کیا گیا ہے ۔

تعارف اور پیش لفظ کے عنوان سے دو تحریریں ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام‌اللہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی ہیں جو بجا طور پر مصنفہ کی محنت کی تحسین کرتی ہیں۔

موصوفہ نے کتاب کو تیرہ ابواب میں تقسیم کیا ہے ۔ باب اول تمہید کے طور پر ہے اس میں گیتوں کی ابتدا اور ان کے ارتقا پر اردو شاعری کی روشنی میں بحث کی ہے اور محمد حسین آزاد کی آب حیات کے حوالے سے حضرت امیر خسرو کو اردو کا پہلا گیت نگار کہا ہے ۔ اور اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ گیتوں کی زبان ، طرز بیان اور تشبیہات و استعارات عام فہم ہیں اور عوام کی روز مرہ کی زندگی سے حاصل کیے گئے ہیں۔ اس باب میں یہ بھی ذکر ہے کہ گیتوں کی تصنیف ، موضوعات ، انداز بیان ، زبان اور موسیقیت سے عورتوں کا گہرا تعلق ہے ۔ کتاب کا انتساب بھی اس بات کی دلیل ہے کہ موصوفہ کو یقین ہے کہ گیت عورتوں کی شاعری ہیں اور وہ انہیں سینہ بہ سینہ منتقل کرتی رہیں۔

باب دوم میں " گیت کی تعریف اور اس کی خصوصیات" پر فنی بحث کی ہے اور اس کے تہذیبی اور ثقافتی پہلو پر روشنی ڈالی ہے

اور اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ گیتوں سے زیادہ اردو شاعری کی کسی صنف میں تہذیب و ثقافت کی آئینہ داری نہیں ملتی۔ گیتوں میں وہ ثقافتی پہلو نظر آتے ہیں جن کا تعلق اردو بولنےوالوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ اپنے اس دعوے کی دلیل میں محترم نے مولوی عبدالحق بابائے اردو کے خطبے کا اقتباس پیش کیا ہے۔ اور مثال میں زچہ گیریاں، لوریاں، رومانوی گیت، پنگھٹ اور میلے کے گیت دیے ہیں۔ اس کے بعد گیت کی ہم گیری، ابدیت، آفاقیت، مقبولیت، ادبی اور لسانی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ موصوف نے ثابت کیا ہے کہ گیت عوامی شاعری ہیں۔ اسی لیے ان میں داخلیت، ترنم اور شیرینی پائی جاتی ہے اسی باب میں گیتوں کی نشاۃ الثانیہ کا ذکر کیا ہے جو عظمت اللہ خاں کی وجہ سے روبہ عمل آئی۔ آگے چل کر بنگال کے گیتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان گیتوں میں وہاں کی معاشرت، علاقے کا ماحول اور زندگی نغموں کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

تیسرے باب میں گیتوں کی ابتدا اور تاریخی پس منظر پر بحث کی گئی ہے اور عہد بہ عہد ان کا جائزہ لیا گیا ہے اور فنی ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حضرت امیر خسرو کے زمانے سےلے کر بھگتی کال شعرا ودیاپتی، کبیر، سورداس، تلسی داس اور میرا بائی کا مفصل تذکرہ ہے۔ صوفیائے کرام کے گیتوں کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے ملتا ہے، گو ان کے ہاں گیت کم دوہے زیادہ ہیں۔ ان کی زبان اور اس دور کی لسانی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔

چوتھے باب میں ان گیتوں کا جائزہ پیش کیا ہے جو مختلف مواقع پر گائے جاتے ہیں اور عورتوں کے جذبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ شادی بیاہ کے گیت، بابل، سہاگ کے گیت، شادیانہ، سہرے،

آرسی مصحف ، پنگھٹ کے گیت ، ساون کے گیت، ان سب کو بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے یکجا کیا گیا ہے، جس سے موصوفہ کی کام سے لگن کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ باب تقریباً سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ محترمہ نے بار بار اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ گیت عورتوں کی تصنیف ہیں۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ آیا ایسا ہے یا نہیں۔

باب پنجم "لکھنؤ کا تہذیبی دور اور گیت" کے عنوان سے ہے اس میں امانت لکھنوی کی اندر سبھا اور آرزو لکھنوی کے گیتوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب ششم دور اصلاح سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں نظیر اکبرآبادی اور عظمت‌اللہ خاں کی شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے اور بڑی تفصیل سے ان پر بحث کی گئی ہے جبکہ نظیر اکبرآبادی کا گیت نگاری میں اتنا زیادہ دخل نہیں ہے۔ عظمت اللہ خاں پر بڑا مفصل اور سیر حاصل تبصرہ ہے، جیسا کہ ان کا بہ حیثیت گیت نگار حق بنتا ہے۔ کم و بیش ۵۰۰ صفحات پر عظمت‌اللہ خاں سے لے کر جمیل‌الدین عالی تک گیتوں پر مفصل تبصرہ اور سیر حاصل بحث کی ہے جس میں تقریباً سب ہی گیت نگار آگئے ہیں۔اس سے مقالہ نگار کی قابلیت اور اہلیت ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے دور قدیم سے دور جدید تک حوالوں کے ساتھ گیتوں کے ارتقائی مدارج کی نشاندھی کی ہے۔ امیر خسرو سے عالی تک نہایت عمدہ احاطہ کیا ہے اور گیت نگاری کی ایک عمدہ تاریخ مرتب کردی ہے۔

کتاب کے آخر میں کتابیات شامل ہے، جس میں ۹۹ کتابیں اور ۲۲ رسائل و اخبارات کی تفصیل موجود ہے۔ اس سے ڈاکٹر صاحبہ مرحومہ کی محنت اور کام کرنے کی لگن کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب میں اشاریے کی کمی ہے۔ اگر یہ بھی شامل ہوتا تو کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا۔

سر دست ہم نے اس جائزے کو مطبوعہ تحقیقی مقالات تک محدود رکھا ہے اور صرف ان ہی کا تعارف اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ ایک قابل لحاظ تعداد پاکستانی خواتین کے ان پی ایچ ڈی کے مقالوں کی بھی ہے جو ابھی شایع نہیں ہو پائے۔ ذیل میں ایسے غیر مطبوعہ مقالات کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔ یہ پاکستان کی صرف تین یونیورسٹیوں تک محدود ہے۔

پنجاب یونیورسٹی

۱۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش: "اردو کی نثری داستانوں میں طنز و مزاح اور ان کے محرکات کا جائزہ"، ۱۹۷۷ء۔

۲۔ ڈاکٹر رضیہ سلطانہ: "اسلامی کلچر، اردو مرثیے میں"، ۱۹۷۹ء۔

۳۔ ڈاکٹر سعیدہ مختار: "نصیرالدین ہاشمی۔ احوال و آثار"، ۱۹۷۹ء۔

۴۔ ڈاکٹر پروین اختر: "اردو مرثیے کا ارتقاء"، ۱۹۷۹ء۔

۵۔ ڈاکٹر فریدہ کنول: "جدید اردو غزل"، ۱۹۸۰ء۔

۶۔ ڈاکٹر نسرین وسیم: "لکھنؤ میں اردو شاعری (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)"، ۱۹۸۰ء۔

۷۔ ڈاکٹر رخشندہ گل: "اردو ادب میں عیسائیوں کی خدمات"، ۱۹۸۱ء۔

۸۔ ڈاکٹر روشن آرا راؤ: "ادبیات اردو میں رسائل کا حصہ"، ۱۹۸۱ء۔

۹۔ ڈاکٹر ناھید کوثر: "اردو شاعری کا ارتقا (۱۷۳۹ء — ۱۸۰۳ء)"، ۱۹۸۱ء۔

سندھ یونیورسٹی

۱۰- ڈاکٹر حسین بانو: "ناسخ اور ان کے تلامذہ"، ۱۹۶۸ء۔
۱۱- ڈاکٹر شمیم نکہت: "اردو میں قرآنی محاورات"، ۱۹۷۳ء۔
۱۲- ڈاکٹر کشور سلطانہ: "اردو میں قرآنی تلمیحات"، ۱۹۷۳ء۔
۱۳- ڈاکٹر رفعت سلطانہ: "اردو نثر پر تصوف کے اثرات"، ۱۹۷۵ء۔
۱۴- ڈاکٹر ثریا صدیقی: "اردو شاعری کا دینی پس منظر"، ۱۹۸۱ء۔
۱۵- ڈاکٹر سعدیہ نسیم: "اردو کے صرفی و نحوی تغیرات"، ۱۹۸۶ء۔

کراچی یونیورسٹی

۱۶- ڈاکٹر مس سکستان لیلیان نذرو: "گارسیں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی، فرانسیسی سے ترجمہ، مقدمہ و حواشی" ۱۹۶۱ء۔
۱۷- ڈاکٹر صدیقہ ارمان: "ممنون حیات اور شاعری"، ۱۹۷۵ء۔
۱۸- ڈاکٹر نسیم سلطانہ: "داستان امیر حمزہ کا تہذیبی مطالعہ"، ۱۹۷۴ء۔

اس تمام جائزے کے بعد چند نکات جو ابھر کر سامنے آئے ہیں اور اس مطالعے کا حاصل کہے جاسکتے ہیں، پیش کیے جاتے ہیں:

پاکستانی خواتین کی ایک قابل لحاظ تعداد اردو تحقیق کی طرف متوجہ ہوئی ہے۔ اس محنت طلب اور صبر آزما کام کو انہوں نے دل چسپی، توجہ، قابلیت اور محنت کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ان کے موضوعاتِ تحقیق کثیر بھی ہیں اور متنوع بھی۔ مراد یہ کہ ان کی تحقیقی دلچسپیاں محض چند دائروں میں محدود نہیں رہیں بلکہ اردو زبان و ادب کے بہت سے گوشوں تک کامیابی کے ساتھ رسائی حاصل کی۔ لسانیات، اردو کے علاقائی جائزے، اصناف شعر و ادب

کا تحقیقی مطالعہ ، خاص خاص طبقوں کی اردو خدمات، ادبی رسائل، اردو اور قرآن، اردو اور تصوف، صرفی و نحوی تغیرات، غرض مختلف موضوعات ان کی تحقیق کا میدان رہے ہیں۔ اگر معیار و مقدار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس لحاظ سے بھی پاکستانی خواتین کا تحقیقی کام قابلِ تحسین ہے اور مستقبل میں اس سے بھی زیادہ تحقیقی کام سامنے آنے کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ بعض تحقیقی مقالات اپنے معیار، مقدار اور اخذِ نتائج کے لحاظ سے صفِ اول کے تحقیقی مقالات میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

کتابیات

۱۔ آزاد، محمد حسین : "آبِ حیات" لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۷ء۔

۲۔ آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر: "شبلی ایک دبستان"، کراچی، ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۷ء۔

۳۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "محمد حسین آزاد"، حصہ دوم، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۵ء۔

۴۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر: "نذیر احمد احوال و آثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء۔

۵۔ " " " : "عروجِ اقبال"، طبع اول، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۸۷ء۔

۶۔ بسم اللہ نیاز، ڈاکٹر: "اردو میں گیت"، کراچی، مکتبہ نیا دور، ۱۹۸۶ء۔

۷۔ تراب علی تراب: "دیوانِ تراب"، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۲ء۔

۸- جمیل جالبی، ڈاکٹر: "تاریخ ادب اردو"، جلد دوم حصہ اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۳ء-

۹- رضیہ نور محمد، ڈاکٹر: "اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی جائزہ"، لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۸۵ء-

۱۰- سکسینہ، رام بابو: "تاریخ ادب اردو" (مترجم عسکری)، لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۹۲۹ء-

۱۱- شاهده بیگم، ڈاکٹر: "سندھ میں اردو"، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۰ء-

۱۲- صفیہ بانو تمنائی، ڈاکٹر: "انجمن پنجاب (تاریخ و خدمات)"، کراچی، کفایت اکیڈمی، ۱۹۷۸ء-

۱۳- عبدالحق، مولوی: "خطبات عبدالحق"، طبع اول، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۲ء-

۱۴- عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر: "خطبۂ صدارت"، آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، منعقدہ حیدرآباد دکن، ۱۹۴۱ء-

۱۵- غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر: "تحقیقی جائزے"، سکھر، بزم غالب، ۱۹۶۸ء-

۱۶- " " " : "علمی نقوش"، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ-

۱۷- " " " : "حالی کا ذهنی ارتقاء"، لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۵۶ء-

۱۸- گارسیں دتاسی: "مقالات گارساں دتاسی"، طبع دوم، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۵ء-

۱۹- " " " : "خطبات گارساں دتاسی"، طبع دوم، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۹ء-

۲۰- معین‌الدین عقیل، ڈاکٹر: "پاکستان میں اردو تحقیق"، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۷ء-

۲۱- نبی بخش خان بلوچ، ڈاکٹر: "سندھ میں اردو شاعری"، حیدرآباد، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء-

رسائل

۱- سہ ماہی اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۸ء-

۲- مجلۂ تحقیق، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۲ء-

۳- قومی زبان، کراچی، مئی ۱۹۸۰ء-